درد آشوب
احمد فراز

ماورا پبلشرز
۳- بہاول پور روڈ
لاہور
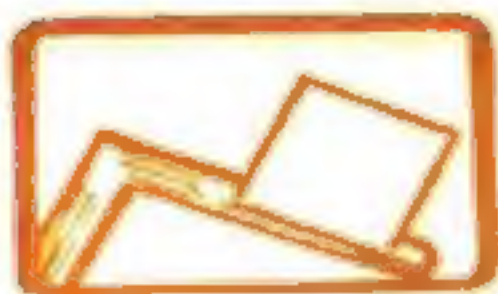
دردِ آشوب

(۱۹۶۶ء کا آدم جی ادبی انعام یافتہ)

احمد فراز

باذوق لوگوں کے لیے

ہماری کتابیں

خوبصورت کتابیں

تزئین و اہتمام

خالد شریف

محبوب اختر کے نام

ترتیب

فن کاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دنیا کے خوابوں کی جنّت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے اِنسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خوں اُگلتے رہے

دو آشوب

۱۰

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تہذیب کی تند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے دنیا کی تہذیب پھولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے سو بار خون جگر سے جلائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہر قاتل کے پیالے پیے
تم مرے تو زمانے کے ہاتھوں مرے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

دو آنسو

۱۱

تم پیمبر سے کتنے دنش سے قدسی
تم نے دُنیا سے دنیا کی باتیں کیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم نے اپنی آنکھیں بھی چھپی کیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے لوچ و رنگ
ہل جو تھے آج بھی ہیں وہ بے سبک
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں سے مرقد پٹے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک کٹے یہ صلے

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

○

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لٹ بھی چکے
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیت ہے زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند رہتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوکِ خنجر کی

ہم اس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

○

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پُرانے میرے

تُو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسّس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

عہدِ آشوب
۱۷

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے

لٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

— ق —

کاش تو بھی مری آواز کہیں سنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تو بھی کبھی آجائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فراز
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

○

نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب، کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے بام و در، یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیبِ دار کوئی تو ہو

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پر
لرز رہا ہوں
مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے بچھڑ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں ایک دوسرے کو کوئی

وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شب خوں سے
بُوئے گل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑ یوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہُوئے رفیقوں کی
زخم خوردہ برہنہ لاشیں
گڑی ہُوئی ہوں

میں جانتا تھا
کہ جب یہ بوجھل اشجار
جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں
ہجوم صرصر میں پیڑ رہتے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو
میں ایک برگِ خزاں بھی
شاخِ نہالِ غم پہ رہ سکوں گا

وہ اِک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مجھے جن آندھیوں کی یورش
خزاں کے طوفان نہ چھو سکے تھے
کہیں نسیم بہار   شاخِ نہالِ غم سے
جُدا نہ کر دے

خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار وہ گیسو
بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادو
حیران پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو
پابندِ تصور نہیں وہ جلوۂ بے تاب
ہو دُور تو جگنو۔ ہے قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگرو
باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر
وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُوکُو
جیسے کوئی قمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دل زری باتوں میں کہاں تک کھوئی جائے

جذبات کی دنیا میں کہاں سوچ کے پہلو
کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہو

مانا اردہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خو
شاید کہ وہ عارض ہوں گلِ تر سے بھی خوشرو
دل کش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

یہ کس کو خبر کس کا مقدر ہے یہ سب کچھ
خوابوں کی گھٹا دور برس جائے گی، ور تو
لوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

○

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اُٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیِ دل ہے تو منزل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمھیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

○

نہ انتظار کی لذت نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سُلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رتجگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رسن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

بہار قرب سے پہلے اجاڑ دیتی ہیں
جدائیوں کی ہوائیں محبتوں کے چمن

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ کہ تو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فراز سلامت ہے یار کا دامن

ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیٔ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
میں ترے شہر سے دور اور تُو مرے دھیان میں ہے

سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر لیے ہر ظلم کے باوصف فراز
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

○

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو! درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فرازؔ اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اِظہار

پتھر کی طرح اگر میں چپ رہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اوّلیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لیے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو

ہم سمجھے تھے پایندہ

وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو

برسوں رکھا تابندہ

دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں

دونوں کیے پر شرمندہ

پیار سے پیارا جیون پیارے

کیا ماضی کیا آیندہ

ہم دونوں اپنے قاتل ہیں

ہم دونوں اب تک زندہ

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کُنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کسے

جل بجھیں دردِ ہجر کی شمعیں گھل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا طاقتِ تابِ انتظار کسے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اس قدر پاسِ طبعِ یار کسے

کاہشِ ذوقِ جستجو معلوم داغ ہے دل چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو کیجے فرصتِ نغمۂ قرار کسے

کون دارائے ملکِ عشق ہوا کس کو جاگیرِ چشم و زلف ملی
"خونِ فرہاد برسرِ فرہاد" قصرِ شیریں پہ اختیار کسے

حاصلِ مشربِ مسیحائی سنگِ تحقیر و مرگِ رسوائی
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ دار ان صلیبوں کا اعتبار کسے

○

دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اب تو ہم لوگ گئے، دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہوگی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھول ہوئی ہے دلِ بیتاب سے بھی

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اس حسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فراز
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

○

وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات کی اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمہارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اُٹھایا کسی نے مینا لیا

فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سنی اور چاہا!
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا ہے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِ لب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دیا جلایا
کب عہدِ وفا کی بات کی تھی
کب ہم نے کوئی ذہب کہا!
بس شام وہ چاندنی وہ خوشبو
منزل کا کسے خیال آیا

تو محوِ سخن تھی مجھ سے لیکن
میں سوچ کے جال بُن رہا تھا
میرے لیے زندگی تڑپ تھی
تیرے لیے غم بھی قہقہہ تھا
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا

○

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو بھلا کے دل ہے وہ شرمندۂ نظر
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

○

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمہاری لگے

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ہمدرد

اے دل! ان آنکھوں پر نہ جا
جن میں وفورِ رنج سے
کچھ دیر کو تیرے لیے
آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک
جو تجھ کو پاگل کر گئی!
ان جگنوؤں کے نور سے
چمکی ہے کب وہ زندگی
جس کے مقدر میں رہی
صبحِ طلب سے تیرگی

کس سوچ میں گم سم ہے تُو

اے بے خبر! نادان حزیں

تیری فسردہ روح کو

چاہت کے کانٹوں کی طلب

اور اس کے دامن میں فقط

ہمدردیوں کے پھول ہیں

خواب

وہ پیار جو میرا ہم سفر تھا
دوری کے اجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اک عمر سے میں ملول و تنہا
ظلمات کی رہگزار میں ہوں
میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں
کیا سوچ کے انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کون ہوں کس دیار میں ہوں

○

سو دوریوں پہ بھی تُو دل سے جدا نہ تھی
تُو میری زندگی تھی مگر بے وفا نہ تھی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یوں دل لرز اُٹھا ہے کسی کو پکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا
اس جاں سپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھو

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مَیں ہوں آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فراز ہم
بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

○

جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا
آج کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہدِ وفا یاد آیا

جس طرح دھند میں لپٹے ہوئے پھول
ایک اک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

اے رفیقو سرِ منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فراز
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

سوال

(فراقؔ کی تصویر دیکھ کر)

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے
لمحات کی اَن گنت خراشیں
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
روٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جو رب چاہتا ہے

غریبِ شہر کے نام

غریبِ شہر تری دکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تری چاہت، تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنّائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام
دریدہ دل! ترے آہنگِ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد فصلِ دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریباں بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام مگر شمعِ رہگزار کی خیر
تمام عمر تو گزرے اس انتظار کی خیر

رخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
بہ سینہ رو بہ سرم دست و پا بریدہ سہی

○

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہلِ تمنا کو فرازؔ
وہ جو محرومِ تمنا ہیں بُرا کہتے ہیں

○

کل ہو چراغِ مے تو سزاوارِ سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مطرب کی بے دلی ہے کہ محفل کی بے حسی
کس زخم سے ہلاک نوا ہائے چنگ ہیں؟

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گم
آنکھیں نگار خانۂ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب و تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ
شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حسنِ سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کشتۂ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں تو اہلِ نشاط کو کیا کریں
ہم خود فراز اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

وہی جنوں ہے وہی کوچۂ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدعا وہ گلِ تر وہ سرو قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر کہ اسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

پیغام بر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لیے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھے پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مو افسردہ رو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلم پر سراپا التماس
اس تمنا پر کہ تم کو مل سکے

غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن — جینے کی آس
ہیں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
میں نہیں جوہر شناس
صورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل ہیں قہقہوں سے چوُر
لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں میں اُمیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دھواں
زندگی سب سے گریزاں
سوئے مقتل سب رواں
سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہمسفر
اِک دوسرے سے بدگماں

سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس
میری باتوں سے میری آواز سے
تم نے یہ جانا کہ میں بھی
لے کے آیا ہوں تمھارے واسطے وہ معجزے
جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمھارے
ان گنت صدیوں کے لاتعداد زخم
دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم
منتظر ہیں قُم باذنی کی صدائے سحر کے
ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں
اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں .... تیرہ جبیں
من و سلویٰ کے لیے دامن کش
قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صرف تقدیر و توکل پر یقیں
تم کو شیرینِ طلب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی بس کو

چیرنے کا حوصلہ یارا نہیں
تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ سر لوہیہ گرفتہ . . . . زندگی سے دور
مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاک، ان کی اس گلِ تاریک کا
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمھارا جزوِ دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف
اور تمھارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی ؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی ؟

سب کی روحیں گرسنہ .... سب کی متاعِ درد ہیں
دوسروں کا خون پینے کی ہوس
ایک کا دکھ دوسروں سے کم نہیں
ایک کا دُکھ تشنگی، بیچارگی
دوسروں کا دُکھ مگر افراط مے .... دیوانگی
پیاس اور نشّے کا دکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشّے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمھاری زندگی شاید نہ ہو
شاکیٔ عرشِ بریں و رحمت اللعالمیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

○

روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک کے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی
ریتلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفاں میں خشک ہو گئے دریا

تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے تو اسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آ جائے میسر تو مقدر تیرا
ورنہ آسودگیٔ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ امید سے تکتا ہے فراز
وہ جو ایک کشتیٔ دل تھی اسے غرقاب سمجھ

خدائے برتر

خدائے برتر
مری محبت
تری محبت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے
تری محبت کا درخورِ اعتنا
فقط بیکراں سمندر
کہ جس کی خاطر
سدا تری رحمتوں کے بادل
کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی
کبھی کسی آبجو کے آنسو

کبھی کسی جھیل کے ستارے

کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اُٹھا کے لاتے

کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں

تری محبت تو اس شہنشاہ کی طرح ہے

جو دوسروں کے ہُنر سے خونِ جگر سے

اپنی وفا کو دوام بخشے

مگر مری بے بساط چاہت

فقط مرے آنسوؤں سے

میرے لہو سے ... میری ہی آبرو سے

رہی ہے زندہ

اگرچہ اس بے بضاعتی نے

مجھے ہمیشہ شکست دی ہے

مگر یہ ناکامیِ تمنا بھی

اس محبت سے کامراں تر عظیم تر ہے

جو اپنی سطوت کے بل پہ
اوروں کی آہ و زاری سے
اپنے جذب وفا کی تشنہ چاہتی ہے
مری محبت نے
جو بھی نام حبیب سے کر دیا معنون
وہ صرف میرا ہے میرا اپنا ہے
اے خدا ئے بزرگ و برتر

○

قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل نے ان زخموں سے روداد دست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فراز
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

○

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آ جاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

○

یہ عالم ذوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بار ہا دیکھا نہ جائے

غلط ہے دوستی پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

وابستگی

آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لیے
ہر ستارہ ہلاکِ صبحِ طلب
منزلِ خواہشِ حبیب لیے

اس سے پہلے بھی شامِ وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہوئے
ہر کوئی سوئے قتل گاہ چلا

درد آشوب
۴

کتنی باہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں کوئے مراد
پھر بھی شب زندہ دار ہیں زندہ
پھر بھی روشن ہے بزمِ رسمِ وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اسی کی مراجعت کے لیے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

○

دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سرخ لہر ہے موجِ سپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حسنِ سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

دنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجھے
بات اس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

ممدوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل ولب کی تعریف
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے
جانے دو دن کی محبت میں یہ بہکے ہوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

ہیں کہ شاعر ہمارے ہاں کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رُخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھِلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
مجھ سے لوچھو تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وہ شمع کہ چھتری بھی پروانہ کرے
میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگیِ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا
میرے پیکر میں تری ذات گھلی ہے اتنی
کہ مرے جسم مری روح نہیں تیرے سوا
میرا موضوعِ سخن تو ہو کہ ساری دنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

○

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اُڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

○

بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پا بستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکاں ہے بہت کم پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دوسروں کے لیے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو تم دور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

اے نگارِ گل

نگارِ گل تجھے وہ دن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اب دل پہ تازیانہ لگے

تری طلب میں وہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اب فسانہ لگے

بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہو کے چراغ
کہ تو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے

اسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا
کہ تجھ کو گردشِ ایام کی ہوا نہ لگے
مگر جو گزری ہے سب ہم پہ ترے جلووں کے بعد
وہ حالِ غم بھی کہیں گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گل وہ ہمیں تھے ترے تمنائی
کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہوئے
ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہوئی
ہمیں ہیں وہ جو تری رہگزر میں خاک ہوئے
خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی مگر
بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہوئے
ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے
ترے حریم میں آ کر ہمیں ہلاک ہوئے

نگارِ گل یہ تقاضہ مگر وفا کا ہے
کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں

گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر
پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں

الم گزیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں

یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا
ہر ایک حال میں توصیفِ حسنِ یار کریں

جبیں سے دھو کے ہر اک نقش نامرادی کا
نگارِ گل ترے جلووں کا انتظار کریں

گُمشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو

عمر گزری ہے سجاتے ہوئے بام و در کو
اس تمنا پہ کہ وہ جانِ بہار آئے گی
فرشِ رہ دیدہ و دل تھے کہ وہ آسودہ خرام
درد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی
اس توقع پہ کھلے رہتے آغوش کش
کھل کے برسے گی اگر اب کے گھٹا چھائے گی
ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے
آخر کار وہ محبوبِ نظر بھی آئی

منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں لیکن
کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی
جسم کیوں شل ہیں دھڑکتے ہوئے دل کیوں چپ ہیں
جرسِ گل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار
سر بھرو! وادیٔ پُرخار میں یہ تو ہوگا
کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دُھواں
آرزوئے لب و رخسار میں یہ تو ہوگا
ایک سے ایک کڑی منزلِ جاں آئے گی
رہگزارِ طلبِ یار میں یہ تو ہوگا

ہونٹ سِل جائیں مگر جرأتِ اظہار رہے
دل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو!

ڈھل چکی رات تو اب کبھی بھی چھٹ جائے گی
اب بھی امید کی لو کم نہ کرو دیوانو!
آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد
گل شدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

○

دل میں اب طاقت، کہاں خوننابہ افشانی کرے
ورنہ غم وہ زہر ہے پتّھر کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریِ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک داماں! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسمِ گل ہے مگر بے رنگ ہے، شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فراز
وہ تو سب کی بات سن لے اور من مانی کرے

○

بے سر و ساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اس سے پہلے شہر کے لٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آ مرے پہلو میں آ اے رونقِ بزمِ خیال
لذتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اس حسن کے لیکن فراز
اتنا کہتے ہیں رہینِ سرمہ و غازہ نہ تھا

○

تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اُٹھی آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب کوئی ماہیِٔ بے آب ہوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اٹھانے والے
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسے

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اٹھا یا برسے

ابر و باراں کے خدا جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنا برسے

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فراز
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسے

○

افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غمِ یار بہت ہو چکی بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہوئی رت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات معطل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلانوش و تہی جام ترس بھی

صیاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومیِ جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

اے مرے بیدرد شہر

دل سلگ اٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اس قدر ویران لمحے، اس قدر سنسان رات
سوچ میں گم ہیں افق سے تا افق پہنائیاں
کس لیے روشن کروں دیوار و در، کوئی تو ہو
کنجِ دیوار و در میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

دورِ شب جاگ اٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں
راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل موجِ رنگ
جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخمِ نظارہ لیے آنکھوں میں چھپ تلتا رہا
گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اڑیں شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اٹھی تھیں میری روح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لیے لَو دے اٹھا تھا اک چراغ
اور دمک اٹھی تھیں کچھ سمٹے مری تنہائیاں!
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے اس قدر رسوائیاں؟

○

گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آکر ناچ
دل بن کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اس بستی کے سارے باسی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیسی نادانی کی
اس لمحے سے لے کر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فراز
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہو زور

○

پھر اسی رہگزر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہمسفر شاید

جان پہچان سے بھی کیا ہوگا
پھر بھی اے دوست غور کر شاید

اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
چمک اٹھے تری نظر شاید

زندگی بھر لہو رلائے گی
یادِ یارانِ بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
پھر بھی تو انتظار کر شاید

○

اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مدتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جدا ہوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دوریٔ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فراز
دوست ملتے نہیں ضیاؔ جیسے

لہ ضیاء الدین ضیا

تریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں
پل بھر کو چمک اٹھے تھے آنسو
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر!
جب میرے لیے ملول تھی تو

کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا
ماضی کی طویل تلخیوں کا!
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا
تو! میرے لیے اُداس اتنی
کیا تھا یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اداسیاں نہ آنسو

اک طنز ہے تیری ہر ادا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو

یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تو

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایام
ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی

لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسم
ہوگا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی

ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی

پہلے کی طرح ہوں گے تہی جام سفالیں
چھلکے گا۔ اک ساغرِ جم اب کے برس بھی

مقتل میں نظر آئیں گے پابستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم اب کے برس بھی

○

تم سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم
بے مروت نہیں تو کیا ہیں ہم

ہم غمِ کارواں میں بیٹھے تھے
لوگ سمجھے شکستہ پا ہیں ہم

اس طرح سے ہمیں رقیب ملے
جیسے مدت کے آشنا ہیں ہم

راکھ ہیں ہم اگر یہ آگ بجھی
جز غمِ دوست اور کیا ہیں ہم

خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

کیوں زمانے کو دیں فراز الزام
وہ نہیں ہیں تو بے وفا ہیں ہم

( )

تجھے اداس کیا خود بھی سوگوار ہوئے
ہم آپ اپنی محبت سے شرمسار ہوئے

بلا کی رو تھی ندیمانِ آبلہ پا کو
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہوئے

گلہ اسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا
وگرنہ یوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہوئے

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غمگسار ہوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فراز پشیماں ہر ایک بار ہوئے

ان دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہو گا ترازوِ ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم

جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنانِ خلقت بے غمِ تیغِ ستم

اپنے اپنے شوق بے پروا کی بازائیں لیے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم

ان میں ہر اک باوفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

ان کی آنکھیں ریزہ ریزہ ان کی جانیں زخم زخم
ان کے آنسو کانچ کے تابوت ریشم کے کفن
ان میں خوابیدہ کسی لیلا کسی شیریں کا خواب
ان میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
ان کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
ان کے ہاتھوں کی لکیروں میں جوانمرگوں کا فن
ان میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنا کا اسیر
ان پہ جو گزری وہ گزرے گی ہر اہلِ درد پر

اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تیری پیشانی کی سج دھج میری چاہت کا غرور
گو یہ وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں
پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخشش ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں ان دیکھے پہاڑوں کے سفیر

○

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہُوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہُوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو !
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تُو ہے نہ وہ ماضی ہے فرازؔ
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں

اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
اس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید ابھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا
اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلق تھا مگر جاں پہ بنی تھی
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

اس شہرِ تمنا سے فراز آئے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

○

ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو

چٹخ اُٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

یہ اور بات کہ اکثر دمک اُٹھا چہرہ
کبھی کبھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو

یہ قربتیں ہی تو وجہِ فراق ٹھہری ہیں
بہت عزیز ہیں یارانِ بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اسے فرازؔ اگر دُکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دُور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

○

کسی طرح تو بیانِ حرفِ آرزو کرتے
جو لب سِلے تھے تو آنکھوں سے گفتگو کرتے

بس ایک نعرۂ مستاں دریدہ پیرہنو
کہاں کے طوق و سلاسل بس ایک ہُو کرتے

کبھی تو ہم سے بھی اے ساکنانِ شہرِ خیال
تھکے تھکے ہوئے لہجے میں گفتگو کرتے

گلوں سے جسم تھے شاخِ صلیب پر لرزاں
تو کس نظر سے تماشائے رنگ و بُو کرتے

بہت دنوں سے ہے بے آب چشمِ خوں بستہ
وگرنہ ہم بھی چراغاں کنارِ جُو کرتے

یہ قربِ مرگِ وفا ہے اگر خبر ہوتی
تو ہم بھی تجھ سے بچھڑنے کی آرزو کرتے

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیمِ بہار
مثالِ برگِ خزاں تیری جستجو کرتے

ہزار کوس پہ تُو اور یہ شامِ غربت لی
عجیب حال تھا پر کس سے گفتگو کرتے

فرازؔ مصرعۂ آتش پہ کیا غزل کہتے
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مَیں اور تُو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہوا بڑھتا ہوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا استادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی
کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سایہ کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کے ملبے کے تلے
اسی دیوار کی بنیاد ہے [illegible]
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

○

کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اُٹھائے رکھنا

اس پہ کیا چارہ کہ ہم آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اس کے جاتے ہوئے پلکوں کو جھکائے رکھنا

افریشیائی ادیبوں کے نام

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل
ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں
دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے گھٹتا ہے
یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں
ہزار لفظ و بیان و زباں کا فرق سہی
مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وہ ماؤ ہو کہ لومبا، سکارنو ہو کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک بسمل
سبھی ہیں دور نظر سے سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سراندیپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سورج تراشنے والے
مگر ہماری زمیں نور کو ترستی ہے
یہ کیا کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اُٹھے
وہ دُور پارِ سمندر پہ جا برستی ہے

زمیں سے اب نہیں اُترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدم و حوّا سنوارنے کے لیے
یہاں محمدؐ و گوتم، مسیح و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیئے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرق شبِ دراز لیے

ہمیں کو توڑنے ہوں گے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہوگا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطۂ تیرہ اُجالنا ہوگا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہوگا

میں کہ پُر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سُوکھے ہُوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

احمد فراز
تنہا تنہا
درد آشوب
نایافت
شب خون
میرے خواب ریزہ ریزہ
جاناں جاناں
ماورا پبلشرز